ڈاکٹر ابنِ فرید کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

''نجم بھائی''

(ڈاکٹر نجم الاسلام پر لکھا جانے والا پہلا مضمون)

[ڈاکٹر ابنِ فرید اُردو ادب میں اپنے منفرد خیالات و افکار کے باعث ایک قابلِ ذکر ادیب قرار دیے جاتے ہیں۔ وہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو ضلع بارہ بنکی، اتر پردیش، بھارت میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر ''جماعتِ اسلامی ہند'' سے وابستہ رہے، اور ایک بھرپور تحریکی زندگی گزارنے کے بعد ۸ر مئی ۲۰۰۳ء کو علی گڑھ میں انتقال کر گئے۔ آپ بلاشبہ نشانِ عزمِ عالی شان ہیں۔

ڈاکٹر نجم الاسلام (یکم جولائی ۱۹۳۳ء۔ ۱۳ر فروری ۲۰۰۱ء) بھی پاکستان آنے سے قبل ''جماعتِ اسلامی ہند'' سے وابستہ تھے۔ اِسی بنا پر دونوں صالحین کے قریبی ذہنی اور فکری روابط قائم ہوئے۔ ڈاکٹر نجم جب جولائی ۱۹۵۱ء میں ''معیار''، میرٹھ کے مدیر ہو گئے تو پھر ان روابط میں اور پختگی آ گئی، لہٰذا اب ابنِ فرید سے تقاضا کر کے تخلیقات حاصل کی جانے لگیں۔ یہ دونوں کی اپنے نظریے پر کمٹ منٹ کی بات بھی تھی اور اپنائیت اور محبت کی بھی۔ اِسی جذبے نے ابنِ فرید سے ایک دل چسپ اور معلوماتی مضمون ''نجم بھائی'' لکھوایا۔ جس میں انھوں نے تنقید، تقریظ اور ذاتی تاثرات کو ایک متوازن سطح پر رکھا ہے۔ ابنِ فرید کا یہ نادر مضمون غیر مطبوعہ تھا، اب پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اس تخصیص کے ساتھ کہ یہ ڈاکٹر نجم الاسلام پر لکھا جانے والا پہلا مضمون ہے۔

ڈاکٹر سیّد جاوید اقبال]

نجم بھائی

''نجم بھائی کبھی سائنس پڑھا کرتے تھے، اب انگریزی ادب کے طالب علم ہیں اور جب انگریزی ادب میں ایم۔اے کرلیں گے تو کیا کریں گے؟______ میں خود بھی نہیں جانتا اور نہ شاید نجم بھائی نے کچھ اس بارے میں سوچا (اور اگر انھوں نے کچھ سوچا ہے تو میں نے پوچھا نہیں بھئی۔ خیر مجھے اس سے کیا غرض''۔[1]

نہ معلوم کیوں جب میں انھیں نجم صاحب یا کسی اور طرح پکارتا ہوں تو مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ میرا ضمیر مجھ سے کہتا ہے، یہ مغائرت ہے اور میں اس اندرونی دباؤ سے خائف ہوکر اپنی مغائرت کو اپنائیت میں تبدیل کرلیا کرتا ہوں۔

نجم بھائی کے اداریوں میں جس طرح ایک فلسفیانہ رچاؤ ہوتا ہے، اُسی طرح اُن کی گفتگو میں بھی فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو داہنے ہاتھ کی انگلیوں کو اس طرح جنبش دیتے ہیں جیسے اپنے پوروں پر ''استدلالی کرہ'' کو نچا رہے ہوں اور جب زیادہ جوش میں آتے ہیں تو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں غیرارادی طور پر جنبش کرنے لگتی ہیں۔ پھر آپ بحث کیجیے اور وہ اختلاف کریں تو سر کو یوں پیچھے جھٹکا دیں گے کہ آپ کو دلائل کی دیوار گرتی ہوئی محسوس ہونے لگے گی اور وہ ایک نامکمل سا قہقہہ بلند کریں گے اور آپ سوچتے رہ جائیں گے کہ وہ سنجیدگی میں ہنس پڑے ہیں یا ہنسنے میں سنجیدہ تھے۔

نجم بھائی کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اسلام پسند ادیب ہیں، کیوں کہ انھوں نے ادب میں ابتدا ہی اس نظریے سے کی ہے۔ ۱۹۴۸ء سے ایک عرصے تک وہ بہ حیثیت شاعر متعارف رہے۔ پھر انھوں نے دو ایک مضامین لکھے اور جولائی ۱۹۵۱ء میں ''معیار'' (میرٹھ) کے مدیر بن گئے۔ اس ذمے داری نے اُن سے متعدد اداریے لکھوائے اور چند ایک مضامین بھی۔ لیکن اس نئی

---

[1] مضمون نگار نے یہ پیراگراف تحریر کرنے کے بعد قلم زد کر دیا تھا۔

مصروفیت نے اُن سے شاعری تقریباً ترک ہی کرادی۔ نہیں بلکہ وہ شعر کہتے رہے اور ایک چونسٹھ صفحے والی کاپی میں جمع کرتے رہے۔ میں[۱] نے ایک بار تقاضا بھی کیا کہ نجم بھائی یہ حرکت اچھی نہیں، لیکن وہ مسکرا کر ٹال گئے۔ اب ۱۹۵۵ء میں، مقامِ شکر ہے کہ ان کی ایک مثنوی[۱] اور ایک غزل[۲] ''معیار'' کے ذریعے منظرِ عام پر آئی ہیں۔

مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے تفریحی ادب (Light Literature) میں انھوں نے صرف ایک طنزیہ و مزاحیہ خاکہ لکھا ہے[۳] جو معیار کے مسترد شدہ مضامین پر مشتمل تھا۔ اس طرح نجم بھائی نے ادب کی تین صنفوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے اداریوں[۴] اور تبصروں[۵] کو ہمیں ایک جگہ رکھنا ہوگا۔ تنقیدی مضامین یا مقالات کو الگ رکھنا ہوگا۔ اور غزل کو الگ، نظمیں شاید انھوں نے نہیں کے برابر کہی ہیں۔ اس لیے تفریحی ادب کی طرح نظم کو بھی اُن سے متعلق نہ سمجھنا چاہیے۔

نجم بھائی اپنے اداریوں میں عام طور پر ایسے مسائل چھیڑنا چاہتے ہیں، جو وقتی نہ ہوں اور تمام اداریے مل کر ایک مربوط تنقیدی مواد پیش کرسکیں۔ چناں چہ وہ جذباتی اپیل یا سطحی اندازِ بیان اختیار نہیں کرتے ہیں۔ بعض اوقات سنجیدگی کو خارج سے داخل کرنے کی سعی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اُن کے اداریے کسی قدر خشک اور فلسفہ زدہ ہوجاتے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ بھی ہے، وہ خود ایک ادبی تحریک سے وابستہ ہیں، جو ذہن و فکر میں صالح، تعمیری اور اسلامی انقلاب لانا چاہتی ہے۔ اس دعوت کو وہ، اس انداز میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اس تحریک سے غیر متعلق قاری بھی اُن کے اداریے اور معیار کے فن پاروں سے فکری اور استدلالی طور پر متاثر ہوں۔ چناں چہ وہ ادب کے لیے ''صحت مند'' اور ''تعمیری'' کی اصطلاحات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اپنے حلقے میں ان اصطلاحات کو انھوں نے بے حد مقبول کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ بہت سے پڑھنے والوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ''معیار'' کے اداریے اپنے فلسفیانہ انداز کی وجہ سے گنجلک ہوجاتے ہیں اور بہت سے لوگ اداریہ پڑھنے کے بعد پرچا نہیں پڑھتے۔ نجم بھائی کو اپنا نظریہ اور تحریک عزیز ہے، چناں چہ اس رائے سے وہ کافی متاثر ہیں۔ اب وہ اپنے اداریوں میں سلجھی ہوئی تحریر اور واضح خیالات پیش کرنے کی کاوش کر رہے ہیں۔

بہ حیثیت غزل گو، نجم بھائی زیادہ معروف نہیں ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر وہ اس صنف پر تھوڑی سی توجہ دیں، تو کتنوں سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس خیال ہے، انداز ہے اور اظہار کا سلیقہ ہے۔ وہ جس مقصد کے علم بردار ہیں، اُس کو انھوں نے اچھی طرح سمجھا ہے اور اُسے الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ قول کے لیے عمل کا تعاون ہونا چاہیے:

ناقد! تری ہر تنقید بجا، کچھ کر کے نمونہ بھی تو دکھا
کہنا تو سبھی کو آتا ہے یہ کام غلط، وہ کام غلط ۶

لیکن پھر وہ خود کیوں غزل میں کچھ کر کے نہیں دکھاتے ہیں۔ اس کا جواب وہ خود دیں گے۔

غزل کے بارے میں اُن کا نظریہ ہے کہ مقصد کی نشر و اشاعت کے لیے اس سے کام لیا جا سکتا ہے اور اچھا خاصا کام لیا جا سکتا ہے، چناں چہ انھوں نے اپنی اور حفیظ میرٹھی کی غزلوں سے اشعار منتخب کر کے ثبوت کے طور پر ایک مربوط مضمون میں پیش کیے ہیں ے۔ ابوالمجاہد زاہد کی شاعری کا بھی انھوں نے اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا تھا ۸۔ تعمیر پسند حلقے میں شاید، عملی تنقید کے شعبے میں یہ ''افتتاحی مضامین'' تھے۔

''عمل اور ردِ عمل'' ۹ کے عنوان سے اُن کے تین چار مضامین کو اگر نظر انداز کر دیا جائے، جو نفسیاتی اور فلسفیانہ موضوع کے حامل تھے، تو نجم بھائی کے سارے مضامین، تعمیری ادب کی نظریاتی تشریح کے حامل پائے جائیں گے۔ اِن مضامین میں اُن کا سب سے اہم مضمون ''اُردو ادب کا تعمیر پسند نظریہ'' ہے جو انھوں نے ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے ''اُردو سمپوزیم'' میں پڑھا تھا ۱۰، اور وہاں کافی پسند کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر عبدالعلیم ۱۱ کو بھی اپنی ایک تقریر میں کہنا پڑا تھا کہ ''ادب کا ایک نظریہ وہ بھی ہے جو اسی پلیٹ فارم سے آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے''۔ اس مضمون میں انھوں نے ادب کے تعمیری نظریے اور دوسرے ادبی نظریات کے موازنے میں واضح استدلالی انداز اختیار کیا ہے ۱۲۔ اور اس مضمون میں (میری نظر میں) وہ خامی بھی نہیں ہے، جو اُن کے دوسرے مضامین میں ہوتی ہے۔ یعنی ____ ''اب میں آپ کے سامنے ____ پیش کرتا ہوں'' ____ ''اب مجھے یہ کہنا ہے'' ____ وغیرہ۔ جب وہ مضامین میں اس موڑ پر آ جاتے ہیں تو نہ جانے کیوں میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ وہ بات کو بے ربطی کے ساتھ ختم ہونے سے بچا رہے ہیں۔

اپنے مضامین میں وہ اکثر حوالے بھی دینا ضروری سمجھتے ہیں، اور بعض اوقات ان حوالوں کے پابند ہو کر بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اپنے آپ پر اس طرح کی پابندیاں عائد کر لینا زیادہ سود مند نہیں ہوتا ہے اور بعض اوقات تو اس سے خود اپنا نظریہ مجروح ہونے لگتا ہے۔

اس مضمون میں نجم بھائی کے مضامین یا نظموں اور غزلوں پر فرداً فرداً تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا ہوں، کیوں کہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں اُس کے ثبوت کے لیے معیار کے صفحات دیکھے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان کی مثنوی ''رزم نامہ'' ۱۳ نے پھر ایک مسئلے کو تازہ کر دیا ہے جس پر میں ایک عرصے سو چتا رہا ہوں اور کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔

''اسلامی ادب'' میں (جسے نجم بھائی ''تعمیری ادب'' کہتے ہیں)[۴] عورت کا کیا مقام ہوگا؟ اور اسے کیوں کر پیش کیا جائے گا؟ اہم مسائل ہیں۔ جاہلی ادب میں جذبات، نفس اور اخلاق پر کوئی ایسی بندش نہیں ہے، جو اُن کے ادیبوں کو کھلی چھٹی نہ دے دے، لیکن اسلامی ادیب اس معاملے میں پابند ہیں۔ انھیں ادب سے ذہنوں کو ہموار کرنے کا کام لینا ہے۔ چناں چہ اگر وہ ادب میں کسی بھی کردار کو یا جذبے کو ناتراشیدہ پیش کر دیتے ہیں، تو قاری کی طرف سے فکری بے راہ روی کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلامی ادب ایک ایسا سفینہ ہے جسے تہ آب چھپے ہوئے لاکھوں جزیروں سے بچا کر صحیح و سالم لے چلنا ہے۔ ایسی صورت میں اگر ہم کسی منظر کی عکاسی کرتے ہیں تو ہمیں اُس لمحے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے کہ کہیں نفس اس سے تلذذ نہ حاصل کر رہا ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہمیں اپنی پوری پوری چابک دستی کا مظاہرہ کرنا ہے کہ ''نقلِ کفر، کفر نہ ہو''۔ اور بے اعتدالی بھی راہ نہ پائے۔ اس کے برخلاف نجم بھائی کی مذکورہ مثنوی میں اس طرح کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں:

ہوا یوں کہ آتی تھی ملکہ یہاں ۔۔۔ وہ دوشیزۂ ہند، شیریں بیاں
گلابوں سے گالوں کے باعث جسے ۔۔۔ دیا نام روزی کا ماں باپ نے

بہت اس کی دلّی میں تشہیر تھی ۔۔۔ اک عالم کے خوابوں کی تعبیر تھی
وہ امریکی شہروں میں کھیلی ہوئی ۔۔۔ وہ سونے کے ڈھیروں میں کھیلی ہوئی
وہ آنکھوں کی ٹھنڈک وہ دل کا سرور ۔۔۔ جوانی کے بدمست نشے میں چُور
جوانانِ کالج کے قصّوں کی ہیر ۔۔۔ کلرکوں کی اِک حسرتِ دل پذیر
ادیبانِ نوخیز اس کے غلام ۔۔۔ لٹاتے تھے دل شاعرانِ کرام

بحث ان اشعار سے نہیں، بلکہ ادب میں صنفِ نازک کے اس طرح تذکرے سے ہے۔ اس مسئلے پر ہمارے ادبی حلقے میں کوئی کام نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے نظریے کی وضاحت اس مقام پر اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے تا کہ عملاً فکری اُلجھاؤ پیدا ہونے سے ادب، ادیب اور قاری کے ذہنوں کو بچا سکیں۔

''تعمیری ادب'' میں نجم بھائی نے تعارفی مضامین کی بھی طرح ڈالی ہے۔ اُن کے اِن مضامین سے بہت ممکن ہے بعض حضرات کو خودستائی کا شائبہ ہو رہا ہو، لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا ہوں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اس طرح کے مضامین اُبھرتے ہوئے ادیبوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے محرک بن سکتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے ادیب ہیں کہ جو اپنے اندر بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن جب اُن کو اُن کے محاسن

اور معائب پر مطلع نہیں کیا جاتا ہے تو وہ پژمردہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک قابلِ قدر شاعر محمود عالم ہیں، جنھوں نے آزاد (نظم) میں ''تعمیری نظریہ'' کو کام یابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مگر کوئی ان کا نام نہیں لیتا۔ اسی طرح منظر حسین اور انور اعظمی کا بھی یہی حال ہے۔ نجم بھائی نے اس طرف توجہ دی ہے اور میں اسے اسلامی ادب کے لیے خوش آئند سمجھتا ہوں۔ ان مضامین میں انھوں نے بے جا ستائش اور پروپیگنڈا سے کام لینے کے بجائے اُصولِ نقد اور اسلامی ادبی وقار کو برقرار رکھا ہے۔ البتہ اس طرح تعارف پڑھتے ہوئے کچھ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ تشنگی شخصیت کا نامکمل تعارف اور ادبی کاوشوں پر انتہائی اجمالی تبصرہ کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔

آخر میں مجھے یہ صراحت بھی کر دینی چاہیے کہ نجم بھائی مشاہیر ادیبوں میں سے نہیں ہیں اور نہ یہ تعارف اُن کی مدح کے لیے لکھا گیا ہے۔ وہ ایک ادیب ہیں، اور اُبھرتے ہوئے ادیب! ہم ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنی کاوشوں اور کوششوں سے جلد اپنا مقام پیدا کر لیں گے، کیوں کہ انھیں اپنی شہرت سے زیادہ اپنے نظریے کی شہرت عزیز ہے۔

حواشی

۱۔ اس مثنوی کا عنوان ''رزم نامہ'' ہے۔ یہ معیار میرٹھ، مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شایع ہوئی۔

۲۔ ''معیار'' میرٹھ میں ڈاکٹر نجم الاسلام کی پہلی غزل مئی ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شایع ہوئی، جس کا مطلع ہے:

اُنھیں اپنی جانب جو کر پایے گا
تو گویا ہر اک غم سے چھٹ جایے گا

ابنِ فرید نے جس غزل کی نشان دہی کی ہے وہ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شایع ہوئی، اس کا مطلع ہے:

آغاز ہی جن کا ٹھیک نہیں، ان کا نہ ہو کیوں انجام غلط
ان کی نہ ہو کیوں ہر بات غلط، ان کا نہ ہو کیوں ہر کام غلط

۳۔ اس مضمون کا عنوان ہے ''ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے'' یہ ''معیار'' فروری ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شایع ہوا۔

۴۔ ''معیار'' میرٹھ کے اداریوں کا انتخاب انشاءاللہ جلد پیش کیا جایے گا۔

۵۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کے تبصروں کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

۶۔ دیکھیے حوالہ نمبر۲۔ پروفیسر حبیب ارشد کہتے ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے دوسرا مصرعہ اس طرح سنا ہے: ''کہنے کو تو سب ہی کہتے ہیں یہ بات غلط وہ کام غلط'' ____ ڈاکٹر نجم الاسلام یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

ایک بار احباب نے اُن سے اس شعر کے خالق کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ میرٹھ کے ایک شاعر کا ہے۔ یہ کبھی نہیں بتایا کہ یہ شعر اُن کا ہے۔ ایک موقعے پر پروفیسر رابعہ اقبال صاحبہ (سابقہ صدر شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو) نے ڈاکٹر نجم سے پوچھا کہ آپ نے شاعری کیوں ترک کر دی؟'' فرمایا: ''میڈم ہماری شاعری میں شاعرانہ رس نہیں تھا اور اس کا اندازہ ہمیں کالج کے زمانے میں ہی ہو گیا تھا''۔ راقم الحروف کے دریافت کرنے پر ڈاکٹر نجم نے فرمایا ''بہت مشاعرے پڑھے۔ ان میں رام پور، علی گڑھ یونیورسٹی کے مشاعروں کے علاوہ میرٹھ کا ایک مشاعرہ جس میں جگر صاحب تشریف لائے تھے۔ یادگار کہے جا سکتے ہیں۔''

۷۔ اس مضمون کا عنوان، ''حفیظ میرٹھی ایک تعمیر پسند غزل گو'' ہے۔ یہ ''مِعیار'' جنوری ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شایع ہوا۔

۸۔ اس مضمون کا عنوان، ''زاہد کا سیاسی تفکر اُس کی غزلوں میں'' ہے۔ یہ ''مِعیار'' اگست ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شایع ہوا۔

۹۔ اس مضمون کی پہلی قسط، ''مِعیار'' جولائی ۱۹۵۱ء اور دوسری قسط نومبر ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شایع ہوئی، وہ شمارے جن میں بقیہ اقساط شایع ہوئی ہیں۔ ہماری دست رس میں نہیں ہیں۔

۱۰۔ یہ سمپوزیم جنوری ۱۹۵۴ء میں ''مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین''، علی گڑھ کے زیر اہتمام، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد ہوا تھا۔ بعد ازاں منور حسن خاں اور قاضی جمال الدین احمد نے اس سمپوزیم میں پڑھے گئے مضامین کو یک جا کر کے ''اُردو ادب کا ارتقا'' کے عنوان سے کتابی صورت میں مئی ۱۹۵۴ء میں شایع کیا۔ اس میں ڈاکٹر نجم الاسلام کا مضمون ''اُردو ادب کا تعمیر پسند نظریہ'' بھی شامل ہے۔ بعد میں یہی مضمون اضافے کے ساتھ ''اُردو ادب اور تنقید کا تعمیر پسند نظریہ'' کے عنوان سے ''مِعیار''، میرٹھ ''تنقید نمبر، طبع اوّل ۱۹۵۴ء میں شایع ہوا۔

۱۱۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا تعلق ''انجمنِ ترقی پسند مصنفین'' سے تھا۔ وہ علی گڑھ میں اس انجمن کے اہم کارکن تھے۔ علی گڑھ میں ''انجمنِ ترقی پسند مصنفین'' کی شاخ اوائل ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی۔ جس کا پہلا اجلاس خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا۔ اس جلسے میں علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ کے علاوہ ڈاکٹر عبدالعلیم بھی موجود تھے، جو اُس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی کے لیکچرر تھے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں ''انجمنِ ترقی پسند مصنفین'' کا پہلا کل ہند اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو ڈاکٹر عبدالعلیم نے اس میں بھرپور شرکت کی۔ اور اس اجلاس میں منظور ہونے والا انجمن کا منشور، انھوں نے محمود الظفر کے ساتھ مل کر تیار کیا۔ اس کے بعد انجمن کا دوسرا اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا اُس میں آپ نے علی گڑھ سے شاہد لطیف اور علی اطہر کے ساتھ شرکت کی۔ اُس زمانے میں انجمن کے جلسے علی گڑھ میں خواجہ منظور حسین کے ہاں باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ جہاں ڈاکٹر عبدالعلیم کی شرکت لازمی تصور کی جاتی تھی۔ ظہور وارڈ میں ہر جمعے کو باقاعدگی سے انجمن کے جو جلسے ہوتے تھے اُن کی صدارت عموماً ڈاکٹر عبدالعلیم کیا کرتے تھے۔ (یہ معلومات رفیق احمد نقوی کے مضمون ''ترقی پسند تحریک اور علی گڑھ'' سے مستفاد ہیں۔ مضمون

مشمولہ ''ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر''، مرتب پروفیسر قمر رئیس، سیّد عاشور کاظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۹ء۔ص ۲۴۵)۔ڈاکٹر شارب ردولوی نے اپنے مضمون (مشمولہ ''ترقی پسند تحریک پچاس سالہ سفر'') ''ترقی پسند تحریک اور اُردو تنقید'' میں ڈاکٹر عبدالعلیم کو ترقی پسند تنقید کی پہلی صف میں شمار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ترقی پسند ناقدین میں ڈاکٹر عبدالعلیم کی حیثیت بھی ایک مارکسی نقاد اور ترقی پسند تحریک وتنقید کے نظریہ ساز کی ہے ___ تحریک کے ابتدائی زمانے میں انھوں نے نظریے کو منطقی اور سائنسی استدلال کے ساتھ پیش کرکے اُردو تنقید کو ایک مستحکم بنیاد دینے کا کام کیا ہے۔(ص ۵۵٦)

۱۲۔ اس سمپوزیم میں پڑھے جانے والے مضمون سے متعلق معلومات نازنین سلیم کے مضمون میں بھی ملتی ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں کہ: ۱۹۵۴ء میں ''آل انڈیا ادبی سمپوزیم''، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ جہاں ڈاکٹر نجم الاسلام نے بہ حیثیت مدیر اپنا پہلا کانفرنس پیپر پڑھا___ اس سمپوزیم کے دیگر شرکا میں خواجہ غلام السیّدین، آل احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور سیّد اصغر علی عابدی شامل تھے___ اس سمپوزیم میں ان کی شرکت درحقیقت ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف تھی۔(''انشاء''، حیدرآباد، ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر، حصہ اوّل، ص ۱٦۵۔)

اس سمپوزیم میں پڑھے جانے والے مضمون کے حوالے سے مختلف مواقع پر ڈاکٹر صاحب نے دو باتوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) ایک روز میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ پروفیسر ارشد رضا صاحب نے آج مجھے بتایا کہ علی سردار جعفری اُن کے ماموں زاد ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہماری اُن سے دو ایک ملاقاتیں ہیں۔ پہلی مرتبہ تو علی گڑھ کے اُس سمپوزیم میں جس میں ہم نے اپنا پیپر پڑھا تھا۔ اُس کے بعد میرٹھ کے ایک مشاعرے میں اور تیسری مرتبہ علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں۔ پھر ایک وقفے کے بعد گویا ہوئے کہ سمپوزیم میں ہم نے جو پڑھا تھا اُس کے متعلق انھوں نے بڑی شفقت سے کہا کہ آپ کا مضمون بہت بھرپور تھا لیکن طوالت کی وجہ سے آخری حصے پر سامعین کی توجہ کم رہی۔ اُس کے بعد اصغر علی عابدی نے بھی اسی طرف متوجہ کیا۔ پھر ہم نے خود سوچا کہ ناتجربے کاری کی وجہ سے واقعی یہ غلطی ہوگئی''۔

غالباً اس واقعے کے بعد سے ڈاکٹر صاحب محتاط ہو گئے تھے۔ راقم کو بھی ایک تقریب میں مضمون پڑھنا تھا۔ مضمون تیار کرکے جب ڈاکٹر صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ تو سب سے پہلے انھوں نے یہ سوال کیا کہ ''کتنے منٹ کا ہے؟'' پھر فرمایا کہ کسی کانفرنس یا سیمینار میں مضمون دس سے پندرہ منٹ کا ہونا چاہیے۔ اور وقت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر ایک دو مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ ہم تو بھئی اکثر ایسا کرتے رہے ہیں''۔

غالباً یہ علی گڑھ کے واقعے کا اثر تھا کہ ڈاکٹر صاحب شعبے کے اساتذہ اور طالب علموں کو یہ روک ٹوک کیا کرتے تھے کہ تقریبات میں پڑھنے کے لیے مضمون کی طوالت کم ہونا چاہیے۔ ۱۹۸٦ء سے آپ نے

شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی میں ''مجلس تحقیق و مذاکرہ'' کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جس میں اساتذہ مختصر تحقیقی مضامین پڑھا کرتے تھے۔ مضمون کی بابت ڈاکٹر صاحب کی تاکید تھی کہ ''پانچ منٹ سے زیادہ کا نہ ہو''۔ اور اساتذہ اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ مضمون سننے کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ ہوتا، اُس کے بعد ڈاکٹر صاحب مضمون کے بارے میں اپنی رائے اور تجاویز دیا کرتے تھے۔ اکثر و بیش تر اسی مجلس میں شعبے کے اساتذہ، شعبہ جاتی مجلّہ ''تحقیق'' میں مقالہ شایع کرانے کے لیے ڈاکٹر صاحب سے مشاورت کے بعد موضوع کا تعین کیا کرتے تھے۔ اور اسی طریقے کے تحت اساتذہ نے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے عنوانات بھی حاصل کیے تھے____ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی کوشش ہوتی تھی کہ شعبے کی تقریبات میں طالبِ علم جو مضامین پڑھا کریں اُس کا دورانیہ کسی صورت میں پانچ منٹ سے زیادہ نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے شعبے میں یہ روایت بھی ڈالی کہ شاگرد جو مضامین تقریبات میں پڑھیں وہ کسی استاد کی نگرانی میں لکھے جائیں چناں چہ ہر تقریب کے لیے شعبے کے کسی نہ کسی اُستاد کو نگرانی کی ذمّے داریاں سونپی جاتی تھیں۔

۲۔ ایک موقعے پر راقم الحروف نے ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کے دوران ڈاکٹر عبدالعلیم کا تذکرہ کیا میری مراد اُردو تھیٹر والے عبدالعلیم سے تھی۔ لیکن شاید میری گفتگو واضح نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے روک کر یہ واضح کیا کہ ڈاکٹر عبدالعلیم دو ہیں۔ آپ جن کی بات کر رہے ہیں وہ اور ہیں اور ایک ڈاکٹر عبدالعلیم علی گڑھ والے ہیں، ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور مشرقی زبانوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پھر مزید فرمانے لگے کہ ایک سمپوزیم میں اُن کی صدارت تھی جب ملاقات ہوئی تھی۔ اُس کے بعد میرٹھ میں بھی ملاقات ہوئی۔ بہت سلجھی ہوئی گفتگو کرتے تھے۔ اُنھوں نے دو ایک بار خط میں ''معیار'' کے حوالے سے کچھ باتیں پوچھیں تھیں، ہم نے اُس کا جواب دیا تھا۔ جب میرٹھ آئے تو انھوں نے اُسی موضوع پر بات کی تھی۔ اُس کے بعد پھر ہم پاکستان آ گئے، تو رابطہ نہیں رہا۔

۱۳۔ دیکھیے حوالہ نمبر ا۔

۱۴۔ ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے ''نگار'' کے تنقید نمبر کے بعد ''معیار'' کا تنقید نمبر نکالا اس کی کیا وجہ تھی؟ ڈاکٹر صاحب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ: ''نگار'' کا ''تنقید نمبر''، ترقی پسند نظریات اور تنقید سے متعلق تھا۔ ہم کیوں کہ ''اسلامی ادب'' کے حوالے سے بات کرتے تھے، اس لیے ہم نے ''اسلامی ادب'' سے متعلق ادبی نظریات اور تنقید کو اُس میں پیش کیا''۔

میں نے عرض کیا: آپ نے اُس میں اسلامی ادب کے بجائے تعمیری ادب پر بات کی ہے۔ تو آپ کے خیال میں ''اسلامی ادب'' اور ''تعمیر پسند ادب'' ایک ہیں یا الگ الگ؟۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا

''اسلامی ادب'' ایک محدود بات ہے جب کہ ''تعمیر پسند ادب'' میں زیادہ وسعت ہے، اس بات کو ہم نے ترقی پسندوں سے بھی منوایا۔''

ڈاکٹر صاحب پھر آپ کے نظریے کو ''اسلامی ادب'' والوں نے قبول کیوں نہیں کیا؟ آپ بھی تو جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ''صرف نعیم صدیقی صاحب نے اس کی شدید مخالفت کی، وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ ''صرف اسلامی ادب کہو''۔

یہ ساری گفتگو راقم الحروف نے پروفیسر حبیب ارشد صاحب کو سنائی تو انھوں نے بتایا کہ: ''۱۹۷۹ء کے لگ بھگ میں نے ''اسلامی ادب'' کے حوالے سے نعیم صدیقی سے کچھ باتیں کیں، تو انھوں نے بڑے اصرار سے کہا کہ ''اب اسلامی ادب کے بجائے پاکستانی ادب کی اصطلاح استعمال کی جانی چاہیے''۔

۷ مارچ ۲۰۰۴ء کو بہاول پور جاتے ہوئے ٹرین میں ایک بزرگ ریٹائر میجر سعدالرحمٰن خاں سے اس موضوع پر خاصی دیر گفتگو رہی۔ یہ کسی زمانے میں سندھ یونیورسٹی میں بھی ڈیوٹی کر چکے تھے۔ بہت باذوق اور علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے کہا ''پاکستانی ادب والی بات ہی سب سے زیادہ درست ہے ــــــ ۱۹۷۱ء کے بعد فوج نے جن خطوط پر سوچنا شروع کیا، اُن میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ صحافی اور ادیب ایک پلیٹ فارم پر رہ کر پاکستان کے لیے کام کریں۔ ''پاکستانی ادب'' پر فوج ہی نے دونوں طرف کے ادیبوں کو متفق کیا ہے۔'' واللہ اعلم بالصواب۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ قمر رئیس، پروفیسر، سیّد عاشور کاظمی: ''ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر''، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء۔

۲۔ منور حسن خاں، قاضی جمال الدین: ''اُردو ادب کا ارتقا''، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء۔

۳۔ نازنین سلیم: ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے نامور شاگردوں کی ادبی خدمات کا جائزہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے اُردو، شعبۂ اُردو، سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۹۸ء۔

رسائل

۱۔ سہ ماہی ''انشاء''، حیدر آباد، (ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر (حصہ اوّل)، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء۔

۲۔ ماہ نامہ ''معیار''، میرٹھ شمارے: مئی ۱۹۵۱ء، جولائی ۱۹۵۱ء، اگست ۱۹۵۱ء، نومبر ۱۹۵۱ء، فروری ۱۹۵۲ء، تنقید نمبر طبع اوّل ۱۹۵۴ء، جنوری ۱۹۵۵ء، مارچ ۱۹۵۵ء، اکتوبر ۱۹۵۵ء، تنقید نمبر طبع دوّم ۱۹۹۵ء۔